Vol.4 No.3 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

ناول "جہنمی لوگ" میں سماجی، تہذیبی اور طبقاتی کشمکش کی تاریخی معنویت

پروفیسر ڈاکٹر محمد احمد قادری

ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز, یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر, بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ڈاکٹر صباحت مشتاق

لیکچرر, بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ABSTRACT

The novel "Jahannumi Log" (i.e. People of Hell), by Shiraz Zaidi seems to have been inspired by Marxist ideology. It could by termed as the representative novel written in the first decade of 21st century in the perspective of the Progressive Movement. Through the powerful characters of Jannat, Nemat, Nawaz, Fuzla, Chheema and Bashiran, an attempt has been made to highlight the social and cultural degradation resulting from the division of different strata of a society. Centring around an impoverished family of a daily wager who lives in a slum beside a sewerage nullah, this novel perhaps is the first of its kind which was ever in Pakistan in 2002. Having been divides into ten chapters, it is spread over 148 pages. In its chapter "Jannat ka Jahannum", the writer has brought forth the pathetic plight of daily wagers handymen. In particular, he details to his readers the day-to-day chit-chat by the characters on such topics as highhandedness of contractors, sexual exploitation of women, their social and political problem and religious views and ideologies.

"جہنمی لوگ" شیراز زیدی کا ناول ہے جو مارکسی نظریات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ یہ ناول 2002ء میں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول کو اکیسیوں صدی کے ابتدائی عشرے میں ترقی پسند تحریک کے تناظر میں لکھا جانے والا نمائندہ ناول بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس میں جنت، نعمت، نواز، فضلا، چھیما اور بشیراں جیسے جاندار کرداروں کے ذریعے طبقاتی تقسیم کے سبب پیدا ہونے والی، سماجی و تہذیبی گراوٹ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کی کہانی نکاسی آب کے لیے شہر کے وسط سے گزرنے والی ندی کے کنارے بسائی گئی کچی بستی میں ایک غریب مزدور خاندان کے گرد گھومتی ہے۔ غالباً پاکستان میں لکھا جانے والا یہ پہلا ناول ہے جو دیہاڑی دار مستری مزدوروں پر لکھا گیا ہے۔ اس سے قبل مارکسی نظریات کے تحت لکھے جانے والے ناولوں میں زیادہ تر اینٹوں کے بھٹوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل کو موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ ناول میں شامل مضمون "جنت کا جہنم" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیراز زیدی کا پہلا ناول ہے جو انھوں نے خاصی کم عمری میں لکھا۔ بقول سلیم شہزاد: "اس میں ایک ایسے موضوع کا انتخاب ہے جو کہ نہ صرف پہلے ناول کی حیثیت سے بل کہ عمر کے جس حصے میں وہ ناول لکھ رہا ہے اس سے بھی بظاہر میل کھاتا نظر نہیں آتا۔"(1) اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مارکسی نظریات کی جڑیں کس حد تک ہمارے ادب میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔

ناول ایک صد اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے جسے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کہانی کا آغاز شہر میں ایک بڑی عمارت کی تعمیر میں مصروف مزدوروں کے احوال سے ہوتا ہے جو کھانے کے وقفے کے دوران ایک دوسرے سے خوش گپیوں اور دکھ سکھ کرنے میں مگن ہیں۔ یہاں مزدوروں کی آپس کی گفتگو میں ٹھیکداروں کے ظلم وستم، مزدور عورتوں کے جنسی استحصال، مزدوروں کے معاشی مسائل اور مذہبی عقائد وخیالات کو واضح کیا گیا ہے۔ یہیں ہمارا تعارف محمد نواز سے ہوتا ہے جس کی بیوی شدید بیمار ہے مگر اس کے پاس بیوی کی دوا دارو کے لیے وقت ہے نہ پیسا۔ دوسرے باب سے محمد نواز کے گھر کی کہانی کھلنی شروع ہوتی ہے جو ایک ایسے تنگ مکان میں رہتا ہے جس میں باورچی خانے، غسل خانے حتا کہ بیت الخلا کی گنجائش بھی بہت مشکل سے نکلتی ہے۔ بیت الخلا کے لیے چھوٹے سے غسل خانے کی چھت پر ٹین کی چاردیواری کی گئی ہے۔(جنت اس کی توجیح یوں کرتی ہے کہ

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

پرانے زمانے کے لوگ نہانے کی جگہ پر ناپاکی پسند نہیں کرتے تھے)، جس تک رسائی لکڑی کی ایک خستہ حال سیڑھی کے ذریعے ممکن ہے اور جس پر بچوں کا چڑھنا مشکل ہے اس لیے انھیں گھر کے باہر نالیاں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ باورچی خانے کے لیے تنگ سے برآمدے کا گوشہ استعمال ہوتا ہے۔

آہستہ آہستہ اس گھر کی غربت کا احوال کھلتا ہے جو کم و بیش بستی کے ہر گھر کی کہانی ہے۔ یہاں سالن پکنا عیاشی تصور ہوتا ہے، بستی کے گھروں میں عام طور پر نمک مرچیں گھول کر یا پیاز سے روٹی کھائی جاتی ہے۔ سماجی طور پر بھرم رکھنے کے لیے کپڑے استری کرنے کے لیے کوئلے کی استری استعمال ہوتی ہے۔ بیمار ہونے پر اسپتال جانے کے لیے وسائل نہ ہونے کے سبب آئے دن اموات ہوتی ہیں، ان سب کا مشترکہ دکھ غربت اور تنگ دستی ہے لیکن اس کے باوجود طبقاتی فرق یہاں بھی نفوذ کیے ہوئے ہے۔ مزدور مستری، مسلم، غیر مسلم، مختلف بنیادوں پر ایک دوسرے سے خائف ، رہتے سب گندی ندی کے کنارے ہیں لیکن ہر طبقہ دوسرے طبقے کے لیے دل میں عداوت پالے ہوئے ہے۔ جو نفرت معاشی بنیادوں پر غریبوں کے دل میں اپنے سے زیادہ پیسے والوں کے لیے ہے، ویسی ہی نفرت مذہبی بنیاد پر ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب کے افراد کے لیے دل میں پالے ہوئے ہیں۔ بنیادی سبب غربت اور تنگ دستی ہی ہے جو تعلیم سے محرومی اور پھر توہم پرستیوں کا باعث بنتی ہے۔ اسی سے معاشرے میں انتشار اور بد نظمی پیدا ہوتی ہے ۔ بشریٰ رحمان نے درست لکھا ہے:

> ”جہنمی لوگ' اسی دنیا کی کہانی ہے جس میں ہم اور آپ بستے ہیں۔ یہ کہانی نئی نہیں ہے۔ ایسی کئی کہانیاں اس زمین پر بکھری ہوئی ہیں، جہاں انسانیت غربت اور افلاس کی چکی کے دوپاٹوں میں پس رہی ہے۔ ایک طرف بلند و بالا محلات اور شاہی لوازمات ہیں اور دوسری طرف کچھ انسان دن رات کی محنت شاقہ کے باوجود پیٹ بھر کے روٹی کھانے کو ترس رہے ہیں۔ ایک طرف دولت بربنائے احترام ہے تو دوسری طرف شرافت و نجابت کا استحصال ہو رہا ہے۔ اصل میں یہ غربت کی کہانی ہے۔ غربت جب کسی کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتی ہے تو پھر مکینوں کو چاٹ جاتی ہے۔“(2)

کارل مارکس اور ولیم فرائیڈ دو ایسے مغربی فلسفی ہیں جن کے نظریات نے دنیا کے ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ کارل مارکس طبقاتی تفریق کو تمام سماجی ناہمواریوں کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ فرائیڈ کے مطابق سماج کی تعمیر و تخریب میں جنس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے مگر انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو سماجی تشکیل میں تعمیر و تخریب کے عمل میں ان دونوں عناصر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف ادوار میں ان کی کمیت اور کیفیت پر بحث ہو سکتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تہذیبی زوال ان میں سے کسی ایک کا شاخسانہ ہے۔ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں جنس اور معاش ہر دو کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں نہ تو جنسی خواہشات ہی کو دبانا احسن عمل ہے اور نہ ہی مال و دولت کمانا معیوب ہے۔ بس ان کے کسب اور حدود کا تعین کر دیا گیا ہے جن میں افراط و تفریط ہی سماجی و تہذیبی زوال کو جنم دیتی ہے۔ یہاں اسلامی تعلیمات کا ذکر اس وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ یہ ناول پاکستان میں لکھا گیا ہے، اس کے بنیادی کردار مسلمان ہیں اور اس ناول کی تہذیبی فضا مسلم معاشرے کی شکست و ریخت کی بھی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ مجھے قائد اعظم کے نام اقبال کے مورخہ 28 مئی 1937 کے مرقومہ خط کے الفاظ یاد آرہے ہیں۔ اقبال نے متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "نئے دستور کے تحت اعلیٰ ملازمتیں تو بالائی طبقوں کے بچوں کے لیے مختص ہیں اور ادنیٰ ملازمتیں وزرا کے اعزا اور احباب کی نذر ہو جاتی ہیں، دیگر امور میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف کبھی غور کرنے کی ضرورت (محسوس) نہیں کی۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔"(3)

کیا وطن عزیز میں جس کا خواب مصور پاکستان نے دیکھا تھا اور مذکورہ بالا خط میں علاحدہ مسلم ریاست کو مسلمانوں کے اقتصادی مسائل کا واحد حل قرار دیا تھا۔(4) صورت حال اس سے بھی کہیں زیادہ بدتر نہیں ہو چکی۔ ہر بڑے چھوٹے شہر کے گلی کوچوں میں بھیک مانگنے والوں کی بڑی تعداد، سڑکوں کے کنارے بیٹھے بیلچے، پھاوڑے اٹھائے مزدوری کے کے لیے گاہکوں کے پیچھے بھاگنے والے مزدور، گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے، ہوٹلوں، ڈھابوں پر بیرا گیری کرتے، جوتے پالش کرتے تعلیم سے محروم بچے، ہاتھوں میں ڈگریاں تھامے نوکریوں کے لیے دربدر ٹھوکریں کھاتے جوان، اسی سال کی

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

عمر میں (جو آرام کرنے کی عمر ہوتی ہے) بہ امر مجبوری، رعشہ زدہ ہاتھوں میں جھاڑیاں اٹھائے ضعیف، گھروں میں جھاڑو پوچھے کا کام کرنے والی، امرا کے ظلم وستم کا شکار بننے والی معصوم بچیاں، آبروریزی کے دکھ جھیلتی ملازمائیں، کیا یہ سب اس اسلامی تہذیب کے زوال کا نوحہ نہیں ہیں جو اقبال کے بقول اقتصادی مسئلے سے کسی طور کم نہیں تھا۔(5)

ڈاکٹروں کو مسیحا کہا جاتا ہے لیکن شومئ قسمت ہمارے ہاں اس مقدس پیشے کی حرمت کو جس بری طرح پامال کیا گیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔عام طور پر سرکاری اسپتالوں میں تعینات تمام ڈاکٹروں ہی نے اپنے نجی کلینک اور اسپتال قائم کر رکھے ہیں جہاں غریبوں کی رسائی ناممکن ہوتی ہے۔بڑی بڑی بین الاقوامی دواساز کمپنیوں کے ایجنٹوں سے بھاری تحائف وصول کر کے مہنگی دوائیاں لکھی جاتی ہیں، بھاری بھاری فیسیں، مہنگے مہنگے ٹیسٹ غریب بے چارہ کہاں سے پیسہ لائے۔سرکاری اسپتالوں کا یہ عالم کہ دوائیں غائب، ٹیسٹ کے لیے آلات ناپید اور سب سے بڑھ کر مسیحاؤں کا مریضوں کے ساتھ رویہ۔کیا یہ سب تاریخی حقیقتیں نہیں ہیں جو ہماری تہذیب و ثقافت کا تمسخر اڑا رہی ہیں۔محمد نواز ایک غریب مزدور ہے۔اسے کام سے چھٹی نہیں ملتی۔بیوی کے علاج کے لیے پیسے اس کے پاس نہیں ہیں۔بڑی مشکل سے بیوی کو اتنا مہیا کر سکتا ہے کہ وہ پڑوسن بشیراں کے ساتھ سرکاری اسپتال سے معائنہ کروالے مگر وہاں مریضوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے، وہ دیکھیے:

> "کمرے میں کبھی کبھی کسی مریض کی بلغم زدہ کھانسی کی آواز گونجنے لگتی تھی۔جنت اور بشیراں کو قطار میں بیٹھے ذرا دیر گزر چکی تو برابر بیٹھی ایک بوڑھی عورت بار بار اٹھتی کھانسی کو گلے میں گھونٹتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔کم بخت کنجری سے باتیں زیادہ کرتا ہے، مریض کم دیکھتا ہے۔۔۔کل بھی اسی طرح دیر کر دی تھی اور پورے ایک بجے حرافہ کو لے یہ جا وہ جا۔کہ ٹائم ختم ہو گیا ہے باقی مریض کل آئیں۔اب روز روز کس سے آیا جاتا ہے۔سارے تو مزدور ہیں۔آج کل والوں میں صرف میں ہی نظر آ رہی ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ رات سے خون آرہا ہے بلغم میں کھانسی اٹھتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ رگیں ٹوٹ رہی ہیں بدن کی۔"(6)

بوڑھی کو بشیراں کا یہ جواب ہماری ملکی تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ:

> "بڑی بی اسپتالوں میں غریب ہی تو آتے ہیں، امیروں کے لیے تو انھوں نے علاحدہ دواخانے کھول رکھے ہیں۔بھاری بھاری رقمیں لے کر خوب اچھی طرح دیکھتے ہیں۔اور انھیں معلوم نہیں کیا، ہمارے سامنے کون بیٹھے ہیں، غریب، بھوکے ننگے، جن کا نہ کوئی والی، نہ وارث" (7)

ڈاکٹر ٹی بی کا خدشہ ظاہر کرتا ہے۔جنت بے چاری ایکس رے کرانے جاتی ہے تو اسے انتہائی حقارت سے کہ دیا جاتا ہے کہ ایکس رے کی فلمیں ختم ہو چکی ہیں بازار سے لانا پڑیں گی۔وہ غریب کہاں سے لاتی؟ اسے جواب ملتا ہے کہ جب فلمیں آجائیں گی تب آجانا۔ناچار بغیر ایکس رے، پرچی پر لکھی ہوئی دوائیاں لینے ڈسپنسری جاتی ہے کچھ گولیاں اسی پرچی میں لپیٹ کر دے دی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ باقی دوائیاں موجود نہیں ہیں، بازار سے لینا پڑیں گی۔بازار سے جو دوائیاں ملتی ہیں۔ان کی قیمت سو روپے طلب کی جاتی ہے۔اتنی زیادہ قیت سن کر جنت اور بشیراں ہکا بکا رہ جاتی ہیں:

> "جنت بولی 'سو روپے، اتنے زیادہ۔کتنی ساری دوا تو اسپتال سے مل گئی ہے۔موٹا آدمی نتھنے چیرتا ہوا بولا 'ارے یہ اسپتال والی گولیاں تو پورے پانچ روپے کی بھی نہیں ہیں۔بشیراں کا منھ غصے سے بگڑا ہوا تھا۔اس نے چولی میں چھپا بٹوہ نکال کر پچپن روپے دکان دار کی طرف بڑھا دیے۔'یہ لو، ساڑھے تین دن کی دوا دے دو۔اور یہ اسپتال والی گولیاں بھی باقی کے پانچ روپے کی ڈال دینا' جنت چونک کر بولی 'یہ تو پہلے ہی بہت ساری ہیں، کیوں' مگر بشیراں نے کوئی جواب دینے کی بجائے اسپتال والی پڑیا سے گولیاں نکال کر وہیں کھڑے کھڑے اسپتال کی وسیع عمارت کے رخ پر اچھال دیں۔لو۔۔۔۔انھیں بھی اپنی ماں کے فلان میں لینا۔"(8)

بشیراں کے اس احتجاج، گالم گلوچ اور نفرت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسپتال کی طرف صرف دوائیں نہیں اچھال رہی بل کہ موٹی سی گالی دے کر لاشعوری طور پر یہ کہ رہی ہے: "لو اپنی آزادی۔اپنی ماں کے فلان میں لے لو، اور بشیراں جیسی گنوار، ان پڑھ عورت فیض کا سا لہجہ اختیار کر بھی نہیں

سکتی جو "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" کہ کر دل کا بخار کم کرلے۔وہ تو" بھوک ادب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی" کی کھلی تفسیر نظر آتی ہے۔اس کی نفرت مہذب الفاظ میں ملفوف نہیں۔اسی کی طرح گنوارو مگر خالص اور سچی ہے۔مصور پاکستان علامہ محمد اقبال نے غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا نقشہ اپنے ایک مضمون "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں کچھ یوں کھینچا ہے:

"مسلمانوں کی قلیل اجرت،غلیظ مکان اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترسے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا۔۔۔لاغرونیم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوں گی۔۔۔الم زدہ گھروں کے اندر جاکے دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنھوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔کئی کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منھ میں نہیں گیا۔"(9)

"جہنمی لوگ"کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہی بل کہ اس سے بھی بدتر تصویر نظر آتی۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آزادی حاصل کرکے ہم نے کیا پایا؟اگر اس کا جواب صرف یہ بھی دیا جائے کہ ہم مذہبی طور پر آزاد ہو چکے ہیں،اپنے اپنے مسلک کے مطابق آزادی سے اپنی عبادات بجالا سکتے ہیں تو یہ بھی تاریخی طور پر سچ نہیں ہو گا۔قبل از تقسیم اگر ہندو مسلم فسادات تھے تو بعد از تقسیم مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا کشت وخون شروع کردیا۔مذہبی طور پر شدت پسندی اور تعصب میں بھی اضافہ ہی ہوا ہے۔مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنا،مقدس مقامات اور عبادت گاہوں میں خود کش دھماکے ہونا آئے دن کی خبریں ہیں ظاہر ہے۔ان کا سبب بھی مفلسی،ناداری اور جہالت ہے۔اسلامی تعلیمات میں جہاں فقر کو کفر سے شدید قرار دیا گیا ہے(الفقر اشد من الکفر)وہاں علم حاصل کرنے کی بھی سخت تلقین کی گئی ہے۔تعلیم حاصل کرو خواہ تمھیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے جیسی کہاوت اسلامی دنیا میں تعلیم کی اہمیت پر دال ہے۔ظاہر ہے جس مذہب کا آغاز ہی"اقراء" سے ہوتا ہو وہ حصول تعلیم کے بنیادی حق سے کسی بھی شخص کے محروم رہ جانے کو کیسے احسن گردانا جا سکتا ہے۔سرسید کی جدید تعلیم کے لیے مساعی اسی لیے تھی کہ علم ہی مسلمان کو حقیقی طور پر مسلمان بناتا ہے کیوں کہ مسلمان نہ تو ظلم سہتا ہے،نہ ظلم کرتا ہے،نہ وہ کسی کو غلام بناتا ہے،نہ کسی کا غلام بنتا ہے۔تاریخ آدم میں اسلام کا ظہور دراصل انسان کی کامل آزادی کا ظہور ہے۔علامہ اقبال 1927ء سے 1930ء تک صوبائی قانون ساز مجلس کے رکن رہے۔آپ نے دو مختلف مواقع پر تعلیمی معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ برتی جانے والی ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا اور ہندو و مسلم اسکولوں کو دی جانے والی امدادی رقم کے سلسلے اعداد و شمار بھی پیش کیے جن کے مطابق 1922-23ء میں پچپن اسکولوں کو امدادی رقم دی گئی جس میں سے صرف سولہ مسلمانوں کے تھے اور 1928-29ء میں اکیس اسکولوں کو امدادی رقم دی گئی جن میں صرف دو مسلمانوں کے تھے اور کل گرانٹ میں سے صرف سات فیصد مسلمانوں کے حصے میں آئی حالانکہ مسلمان پسماندہ بھی تھے اور صوبے میں اکثریت کے حامل بھی تھے۔(10)اب اس آزاد ملک میں جہاں قدم قدم پر سرکاری اور نجی اسکول ہیں،فلاحی ادارے قائم ہیں جنھیں بچوں کی تعلیم کے لیے بھاری امدادی رقوم ملتی ہیں۔غریب بچوں کی ایک کثیر تعداد تعلیم سے محروم کیوں رہ جاتی ہے؟اس کا جواب نوازسے سنیے جو وہ اپنی بیمار بیوی کو دیتا ہے جسے آرزو ہے کہ اس کے بچے بھی پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جائیں:

"رہتی کچی بستی میں ہے اور باتیں سنو اس کی،تو کیا سمجھتی ہے سرکار اندھی ہے؟سب معلوم ہے اسے،یہ جو جمعدار سارے شہر کی غلاظت اور گندگی کچی بستی میں آکے پھینک جاتے ہیں ناں یہ سب سرکار کے حکم پر ہے اور ادھی سے جب ایک ایک گھر میں کئی کئی بیماریاں پھیلتی ہیں اور لوگ دھڑا دھڑ مرتے ہیں تو کیا علاج کرواتی ہے سرکار۔۔نہیں ناں۔۔بھلا ہماری تو جانوں کی قیمت نہیں تو کہتی ہے کہ ہمارے بچے اسکول جائیں،بابو بنیں۔۔ہونہہ۔۔اری ان کی زندگی کی دعائیں مانگا کر جیسے ہم جیے ہیں،یہ بھی جی لیں گے،یہ کوئی ہم سے الگ تھوڑی ہیں۔"(11)

ڈاکٹر مشتاق عادل نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ ان بےچارے غریبوں کے دل میں بھی ارمان ہوتا ہے کہ وہ پڑھا لکھا کر اپنے بچوں کو اچھا اور بڑا آدمی بنائیں مگر حالات ناساعد ہونے کی بنا پر وہ ایسا نہیں کر سکتے۔اگر چائلڈ لیبر کے خاتمے کی کوششیں کرنے والے اور ہر بچے کو اسکول پہنچانے کے لیے فکر مند رہنے والے حکمران یہ سوچ لیں کہ اگر ان مفلسوں کی دو وقت کی روٹی کی ضرورت پوری ہو جائے تو یہ اپنے بچوں کو خود بخود اسکول بھیجیں گے۔(12)مسئلہ وہی دو وقت کی روٹی ہے۔جب بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑتے ہوں،مرنے والے کے لیے دوانہ ہو تو اسکول

کسے سوجھتا ہے۔جنت جیسی نہ جانے کتنی مائیں دوسروں کے بچوں کو اسکول آتے جاتے دیکھ کر روز اپنے بچوں کی محرومی پر کڑھتی ہوں گی۔ناول نگار نے بچوں کو اسکول آتے جاتے دیکھ کر ایک غریب ماں کے دل کی کیفیت کو جس طرح بیان کیا ہے۔وہ صرف اس مجبور ماں کے ارمانوں کا خون ہی نہیں ارباب اختیار کے لیے آئینہ بھی ہے:

> "بچے بھی دیکھے میں نے۔۔واہ۔۔کیا خوبصورت،اتنے اچھے لگتے تھے اسکول کی وردی میں۔میرے ہوتے ہی بڑی گاڑی میں آئے تھے۔۔میری نعمت اور فضلا بھی کتنے اچھے لگتے اگر اسکول جاتے،مگر ہمارے پاس تو مرتوں کے لیے دوا تک نہیں ہوتی۔۔شید ابتاتا تھا کہ سو دو سو کا تو پستہ بادام موروں کو روز کھلا دیتے ہیں بچے اپنے جیب خرچ سے۔۔اور کتے بھی تو خوب بڑھیا چیزیں کھاتے ہوں گے۔۔۔اور نعمت کے زرد چہرے پر نظریں جماتی ہوئی بولی۔اچھا خدا!تو جسے چاہے بے حساب دے دے۔"(13)

تاہم یہ غریب اپنی محرومی کا ذمے دار خدا کو نہیں سمجھتے۔ان پڑھ ہونے کے باوجود انھیں اتنی سمجھ ضرور ہے کہ ان کی اس حالت کا ذمے دار خدا نہیں بل کہ وسائل پر قبضہ کرنے والے اور دنیا کی بندر بانٹ کرنے والے ہیں۔جنت جب حسرت سے کہتی ہے کہ خدا جسے بے حساب دے تو چھیما اسے سمجھاتی ہے کہ خدا تو سب کو برابر دیتا ہے۔وہ جنت کو بتاتی ہے کہ مولوی مہر علی مرحوم نے بابا خیر دین کو بتایا تھا کہ خدا نے تو زمین بنادی،اس میں بیج بو دو،کاشت کرو تو پھل پھول پیدا ہو جائیں گے۔اللہ تعالیٰ سے شکوہ تو جب بنتا ہے جب زمین رزق پیدا نہ کرے۔وہ خدا جو بچے کے دنیا میں آنے سے پہلے ماں کے دودھ کی صورت میں اس کا رزق بھیج دیتا ہے،وہ ناانصافی کیسے کر سکتا ہے۔اللہ تو سب کو رزق دیتا ہے،تقسیم بندے کی ذات کرتی ہے۔اسی لیے اس میں ناانصافی ہوتی ہے۔چھیما جنت کی مثال دیتے ہوئے بتاتی ہے کہ اس کی سمجھ میں یہ بات اس وقت آئی جب وہ ایک ایسی کوٹھی میں کام کرتی تھی جس کے مالک کو کتے پالنے کا شوق تھا۔اس نے بہت سے کتے پال رکھے تھے۔ایک دن جب وہ جھاڑ پونچھ سے فارغ ہو کر باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ وہ ملازم جو کتوں کی رکھوالی کے لیے رکھا گیا تھا۔بہت سا ابلا ہوا گوشت لے کر آیا اور کتوں کے سامنے ڈال دیا،باقی ماجرا چھیما کے الفاظ میں سنیے:

> "اب اس نے کسی خاص کتے کو زیادہ تھوڑی دیا،سب کے لیے ڈالا تھا۔۔اور پھر کتے غرا کر گوشت پہ لپکے۔۔۔بڑے کتے ،چھوٹوں کو غرا کر بھونک کر پرے دھکیل دیتے تھے اور چھوٹے کتے بے چارے دم دبا کر ایک آدھ ٹکڑا کھسکانے کی کوشش کرنے لگتے مگر سارا گوشت تو بڑے کتے ٹھونس رہے تھے،چھوٹوں کو کیا خاک ملتا،پس اس دن مجھے مولوی صاحب کی بات یاد آگئی۔۔۔یہ جو کوٹھیوں والے ہیں ناں،یہ بڑے کتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ان کے پیٹ بھی بڑے ہوتے ہیں اور ہوس بھی،ہمارے جیسے تو ان کی ایک غراہٹ پہ دبک کے بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی دمیں ہلاتے ہوئے ان کی چھوڑی ہڈیاں بھنبوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔"(14)

غربت کے مارے یہ نادار اور لاچار لوگ اپنا استحصال کرنے والوں کو خوب پہچانتے ہیں اور ان کے دلوں میں شدید نفرت موجود ہے مگر یہ بے بس اور مجبور لوگ سوائے دل میں بغض پالنے اور گالیاں دینے کے کچھ نہیں کر سکتے۔یہ اپنے استحصال کو زندگی کی قیمت کے طور پر قبول کر لیتے ہیں اور ساری عمر کڑھتے ،سسکتے رہتے ہیں۔پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے ان کی عورتیں گھروں سے باہر نکلتی ہیں اور اپنی عصمت گنوا بیٹھتی ہیں تو یہ بھی ان کے لیے کوئی معیوب بات نہیں رہ جاتی۔کیوں کہ ایسا وہ جنسی خواہش کے تحت نہیں پیٹ بھر روٹی کھانے کے لیے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کے تحت کرتی ہیں۔وہ معاشرے جہاں مروت،محبت کے جنازے نکل چکے ہوں اسی اصول کے تحت چلتے ہیں۔ہر شخص آگے نکلنے کی دوڑ میں دوسرے کو روندنے کے چکر میں رہتا ہے۔امیر غریب کو کچلتا ہے،مگر غریب بھی غریب کو معاف نہیں کرتا،یہ عورتیں بے چاری سرمایا داروں سے بچتی ہیں تو ٹھیکے دار اچک لیتے ہیں،ٹھیکے داروں سے،مستری،مستریوں سے مزدور اور گھروں میں کام کرنے والے ان ہی جیسے نوکر چاکر۔ان کے جنسی استحصال کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ کچی بستی کی گنوار عورتیں عیاشی کے لیے دوسرے مردوں سے تعلقات نہیں بناتیں،یہ خود کو فروخت کرتی ہیں مگر بہت سستا۔ایسے میں ان کے اندر کی عورت انھیں ہر لمحے ملامت کرتی رہتی ہے،مگر یہ ملامت بھوک کے سامنے ٹھہر نہیں پاتی۔

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہم آزادی کے وقت عورتوں کی عصمت دریوں کے واقعات تاریخ وادب کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، کشمیر میں مسلم عورتوں کے جنسی استحصال کا ذکر سنتے ہیں، وطن عزیز میں بھی ایسی مکروہ خبریں اکثر و بیشتر سننے میں آتی ہیں مگر ان کے خلاف کوئی نہ کوئی مزاحمتی آواز کہیں نہ کہیں سے ضرور اٹھتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ گھروں سے بہ امر مجبوری کام کے لیے نکلنے والی خواتین کو اپنی عزت محفوظ رکھنے کے لیے کیا کیا جتن اٹھانے پڑتے ہیں۔ بہت سی تنظیمیں ہیں جو ان کے حقوق کے لیے کم سے کم آواز لازمی بلند کرتی ہیں مگر اس معاشرے میں چھیما اور بسنتی جیسی کتنی ہی لاچار عورتیں موجود ہیں جن کے ساتھ ہم دردی کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ بسنتی جو ایک مزدور عورت ہے اور اس کی غیرت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا بچہ بھیک مانگے وہ ٹھیکے دار کے ہاتھوں پامال ہونے کو مذموم نہیں، اپنی نوکری کا حصہ سمجھتی ہے، اسی لیے اپنی لاج اور عزت کے ثبوت میں وہ مزدوروں سے گفتگو میں کہتی ہے:"اور تم تو بسنتی کے بارے میں بھی یہی سوچتے ہو گے مگر ٹھیکے دار کے علاوہ کسی کا ہاتھ لگانا ثابت کر دو تو سب مل کے موت دینا بسنتی کے منھ پہ۔"(15) تو ایسا لگتا ہے کہ بسنتی کے لیے یہ بات طے شدہ ہے کہ مزدور عورت کے صرف ہاتھ اور دماغ ہی نہیں پورا جسم، آجر کی ملکیت ہوتا ہے مگر ان کا سب کچھ کوڑیوں کے مول ہی بکتا ہے کیوں کہ وہ خود کو لگژری لائف اسٹائل کے لیے نہیں پیٹ بھرنے کے لیے فروخت کرتی ہیں۔ چھیما اس ناول کا تلخ مگر ہمدرد کردار ہے۔ وہ جنت کو اس کے شوہر کے مرنے کے بعد کوٹھی کے لاڈلے ملازم شیدے سے سفارش کر کے کام پہ رکھواتی ہے۔ ایک دن جب جنت اسے شیدے کی کوٹھڑی سے نکلتے دیکھ لیتی ہے تو اس طرح جنت سے سامنا ہونے پر اس کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ چھیما ہی کے الفاظ میں دیکھیے کہ ان میں کتنا درد، کرب اور تلخی عیاں ہے:

> "دیکھ لی مجھ بدکردار کی اوقات، کاش تیرے سامنے یوں بے عزت نہ ہوتی، بھرم رہ جاتا میرا۔ پر اب مجھ کرموں جلی کی بھی سن لے جس نے چھوٹی سی عمر میں دنیا کو پرکھ لیا تھا۔ کوئی کسی کا ہمدرد نہیں ہوتا، نہ بغیر مطلب کے تعلق رکھتا ہے، دنیا تو کچھ لو اور کچھ دو کی بات کرتی ہے اور ہم جیسی فقیرنیوں کے پاس دینے کو سوائے چمڑی کے اور کچھ نہیں ہوتا، پر لینے کی بہت کچھ ضرورت ہوتی ہے، سو وہ دنیا ہماری مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر کبھی کوڑیوں میں اور کبھی مفت وصول کر لیتی ہے۔ سنا، اب جب میں ننگی ہو ہی چکی تو مجھ حرام کار، بدمعاش عورت کی بھی سن لے جو پیٹ کے جہنم کے لیے حرام پر مجبور ہوئی۔ دیکھ غور سے دیکھ میری شکل، کس چیز کی کمی ہے مگر دام میں کوڑیوں کی ہوں اور شیدے جیسوں کو تو مفت ہی۔"(16)

البتہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کرب کی یہ شدت صرف عصمت فروشی پر مجبوری کی بنا پر ہے یا اس میں عصمت فروشی میں بھی طبقاتی محرومی نے احساسِ زیاں کو بڑھا دیا ہے۔ اگلے چند جملے اور دیکھیے:

> "اور وہ جو صاحب کے لیے آتی ہے، شکل دیکھ لے تو قے آجائے تجھے، سر جھاڑ منھ پھاڑ مگر تن پہ ہزاروں کے کپڑے۔۔ ہونہہ۔۔ پھٹکار زدہ شکل پہ خوب لیپ کر کے گاڑی میں آتی ہے اور شیدے سے پوچھ کیا کچھ لے جاتی ہے۔ ہم تو چیتھڑے پہننے والیاں ہیں۔ اسی لیے تو چیتھڑوں کے بھاؤ بکتی ہیں۔ سنا تو نے اچھا ہوا تیری نعمتے مر گئی۔ اب اس کا کون سا باپ بیٹھا تھا۔ ٹکوں کی ہیں ہم سب، تو بھی، میں بھی اور ساری کچی بستی والیاں۔"(17)

ڈاکٹر مشتاق عادل نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناول نگار نے مزدور پیشہ خواتین کے مسائل کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور بڑی خوب صورت منظر کشی کرتے ہوئے۔ واضح کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں حالات کی ماری ستم زدہ عورتیں محنت مزدوری کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکلیں تو انھیں دیگر مشکلات کے ساتھ ساتھ اپنی عزت بھی داؤ پر لگانی پڑتی ہے۔ ٹھیکدار مزدوری کرنے والی عورتوں سے کام کروانے کے ساتھ ساتھ ان کا جسم نوچتے ہیں مگر راج گیر اور ساتھی مزدور بھی انھیں طرح طرح ستاتے ہیں(18) ان کے بقول جہنمی لوگ پر تنقید اور تبصرے کرنے والے اکثر ناقدین نے اس ناول کو اہم قرار دیا ہے اور ادبی حلقوں میں اسے پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ناول کے مشہور محقق اور نقاد ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ناول کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "نوجوان ناول نگار شیر از زیدی کا مختصر سا ناول جہنمی لوگ اس اعتبار سے لائق اعتنا ہے کہ انھوں نے غربت وافلاس کے مارے ہوئے لوگوں کی بستی کو مرکز بناتے ہوئے ان کی جہنم ٹائپ زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اس ناول کو ترقی پسندانہ رجحان

کے تحت رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ ہمارا معاشرہ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے دکھوں، المیوں اور چھوٹی سی اور مختصر سے لمحوں میں معدوم ہو جانے والی خوشیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ لہٰذا غربت و مفلسی کے تمام سروکاروں کے حوالے سے یہ ناول شوق سے پڑھا جا سکتا ہے۔"(19)

"جہنمی لوگ" کی سماجی اور تہذیبی فضا کی بات کی جائے تو وہ بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ ہونی چاہیے۔ یعنی کہ ناگوار، مگر قابل توجہ اور قابلِ اصلاح۔ البتہ اس میں ناول نگار کو دوش نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ اس نے یہ ناول بند کمرے میں بیٹھ کر نہیں لکھا بل کہ وہ خود اس ماحول کا حصہ بن گیا جس میں اس نے اس ناول کو تخلیق کیا ہے۔ وہ اگر کچی بستی کی فضا کو زبردستی مہذب بنانے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ تاریخی معنویت دب کر رہ جاتی جو اس ناول کا خاصہ ہے اور اس ناول کا ہر منظر اور ہر کردار مصنوعی ہو جاتا۔ یہاں میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ناول میں تخلیقی جمال کی کمی ہے، ناول نگار کا یہی کمال ہے کہ اس نے بدصورتی سے خوب صورتی کو تخلیق کیا ہے۔ ناول میں منظر کشی کے عمدہ نمونے موجود ہیں اور ناول نگار کی فنی چابک دستی کے شاہد ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس ناول کی تہذیبی فضا اس سلوک کا منطقی نتیجہ ہے جو استحصالی عناصر نے اس طبقے سے روا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر یوں کہوں کہ اگر علی احمد مزدور شدید دھوپ اور گرمی میں مسلسل کام کرتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر پڑے اور ٹھیکدار اسے اس شرط پہ آدھے دن کی چھٹی دے کہ آدھی دیہاڑی کاٹوں گا اور علی احمد کے گھر پہلے ہی فاقے ہو رہے ہوں تو وہ ایسی تہذیب کہاں سے لائے گا جس کی توقع ہم بجا طور پر اشرافیہ سے کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق عادل رقم طراز ہیں:

"جہنمی لوگ" شیر از زیدی کا ناول ہے جس میں راج گیروں کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول نگار نے گہرے مطالعے کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ناول کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس پیشے سے وابستہ افراد کا سرمایادار طبقہ کیسے استحصال کرتا ہے اور ٹھیکے دار ان مزدوروں کی مجبوریوں سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان لوگوں کو صحت کے حوالے سے کس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سرکاری اسپتالوں میں غریبوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ناول میں مزدوروں کے مسائل کا باریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ صبح سے لے کر شام تک دن بھر مشقت کر کے خون پسینہ ایک کرنے والے ان افراد کے معاشی حالات ناگفتہ بہ ہیں۔۔۔ غریبوں کو تعلیم اور صحت کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ناول نگار نے مزدوروں کی زندگی کی مشکلات کو اتنے شاندار پیرائے میں بیان کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"(20)

"جہنمی لوگ" کے بہت سے پہلوؤں پر بات ہو سکتی ہے۔ اس میں کچی بستی میں رہنے والوں کے بہت سے مسائل کو موضوعِ بحث بنایا گیا۔ شکم کی آگ بجھانے سے لے کر جنس کے حاویے میں جھلنے تک، گنواروں کی زبان، ماحول، نفسیات، کیفیات، روزمرہ گھریلو زندگی کے واقعات، ان کی مذہبیت، توہم پرستی، جہالت، نادانی، خوشی، غمی، موسم کے اثرات، بچوں کے کھیل کود، نفرت، غصہ، عصبیت، ان سب کا یہ ناول احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کہیں مکالمے کے اور کہیں بیانیے کے ذریعے ان تمام مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ منظر کشی بھی کمال کی ہے اور زبان کا استعمال بھی اسی طبقے کے مطابق ہے۔ کہیں ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ جنت یا نواز کے منہ میں مصنف نے اپنے الفاظ ٹھونس دیے ہیں۔ سب کچھ اصل اور فطری نظر آتا ہے مگر فی الوقت اس ناول کا اسلوبیاتی مطالعہ میرے موضوع سے باہر ہے۔ میں نے زیادہ تر اس ناول کے سماجی اور تاریخی رویوں ہی سے سروکار رکھا ہے۔

حوالہ جات

1۔ سلیم شہزاد، مضمون، "جنت کا جہنم"، مشمولہ "جہنمی لوگ" مصنفہ شیر از زیدی، (لاہور: فکشن ہاؤس، 2002) ص:9

2۔ ایضاً، بشریٰ رحمان، مضمون، "زندگی کو کھوجتا ناول، ص:7-8

3۔ محمد جہاں گیر عالم، ترتیب و تہذیب، "اقبال کے خطوط جناح کے نام"، (لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، 2002 (
ص:70

4۔ ایضاً، ص:71

5۔ ایضاً، خط مرقومہ 20 مارچ 1937، ص:67

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

6۔زیدی،شیراز،"جہنمی لوگ"،ص:38
7۔ایضاً
8۔ایضاً،ص:41
9۔ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر،مترجم،"مولانا ظفر علی خان"(لاہور:ہفت روزہ"رفتار زمانہ"،جلد2،نمبر10،ستمبر1949ء)،ص28-29
10۔خورشید،عبدالسلام ڈاکٹر،"سرگذشتِ اقبال"(لاہور:اقبال اکادمی،پاکسان،1996ء)،ص:176
11۔"جہنمی لوگ"،ص:45
12۔عادل،مشتاق،ڈاکٹر،"پاکستانی اردوناول اور طبقاتی کشمکش"،(ساہیوال:فروغ زبان پبلشرز،جولائی2021ء)،ص:239
13۔"جہنمی لوگ"،ص:116
14۔ایضاً،ص:117
15۔ایضاً،ص:31
16۔ایضاً،ص:130
17۔ایضاً
18۔عادل،مشتاق،ڈاکٹر،"پاکستانی اردوناول اور طبقاتی کشمکس،ص:233
19۔خان،ممتاز احمد،ڈاکٹر،"اردوناول کے ہمہ گیر سروکار"،(لاہور:فکشن ہاؤس،2012ء)،ص155
20۔ عادل،مشتاق،ڈاکٹر،"پاکستانی اردوناول اور طبقاتی کشمکس،ص:227-228